مولانا محمد حسین آزاد کی ماضی پرستی کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

A research and critical review of Maulana Muhammad Hussain Azad's Pastism

صنم اقبال

ایم فل سکالر، مسلم یوتھ یونی ورسٹی، اسلام آباد

Sanam Iqbal

M.Phil Scholar, Muslim Youth University, Islamabad

Abstract:

Maulana Muhammad Hussain Azad is a great Urdu poet and writer. He has done very useful research regarding Urdu literature. He was also given the title of Shams Ul Ulamma. Azad's pastism is very prominent. He has cited the past as an example. According to Azad, the literature of the past, the society of the past and the writers of the past were very exemplary people. This is the reason why they have remembered the past.

Key words: Maulana Muhammad Hussain Azad, literature, pastism

کلیدی الفاظ: مولانا محمد حسین آزاد، ماضی پرستی، ادب

مولانا محمد حسین آزاد کا شمار اردو کے جید ادبا میں ہوتا ہے۔ ان کا تعلق ادبی گھرانے سے تھا۔ اپنے اجداد کی طرح خود آزاد نے بھی ادب کی بہت خدمت کی۔ ان کی تخلیقات اور تحقیقات اردو ادب کا عظیم سرمایہ ہیں۔ آزاد نے جہاں اردو کے ادب میں نئے نئے چراغ روشن کیے ہیں وہیں انہوں نے ماضی کو بھی فراموش نہیں کیا۔ ان کے تحقیقی اور تخلیقی شاہکار اس بات کے گواہ ہیں کہ آزاد نے ماضی کے تخلیقات کو نئے انداز میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نئے نئے خیالات بھی قارئین کی نذر کیے ہیں۔

آزاد کی پیدائش کے حوالے سے مؤرخین میں اختلاف پایا جاتا ہے تاہم زیادہ تر مؤرخین نے ۱۰ جون ۱۴۸۳ کی تاریخ کو درست قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں مظفر حنفی نے لکھا ہے۔

> ”محمد حسین آزاد کی تاریخ پیدائش میں کچھ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ کسی نے ان کا یوم ولادت ۱۷ ستمبر ۱۸۶۹ لکھا ہے تو کہیں سال پیدائش ۱۸۶۷ بیان کیا گیا ہے۔ زیادہ تر محققین کی رائے ۱۰ جون ۱۴۸۳ (جمعرات) کے حق میں ہے اور یہی تاریخ پیدائش ان کے مزار پر کندہ ہے۔ لہذا اسی کو درست سمجھا جائے۔“[1]

مولانا آزاد کے اجداد میں علمی ذوق پایا جاتا تھا۔ ان کے دادا اور والدِ گرامی بھی دینی اور ادبی ذوق کی حامل شخصیت تھے۔ اس ادبی ماحول اور ذوق کا انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ادبی اور تخلیقی سفر کو مزید آگے بڑھانے کی کوشش جاری رکھی۔

آزاد کے اسلاف درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے۔ دینی علوم کی تدریس کے لیے مدرسہ قائم رکھا تھا۔ مولانا آزاد کے والد مدرسے میں پڑھتے تھے۔ ان کی تفصیلات ڈاکٹر رشید اشرف خان نے ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔

> ”مولانا محمد حسین آزاد کے دادا مولانا محمد اکبر ایک معروف عالم دین اور مجتہد تھے انہوں نے اپنا ایک مدرسہ قائم کر رکھا تھا۔ جس میں علوم نقلی و عقلی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا محمد اکبر کے لائق فرزند مولانا سید محمد باقر تھے جو تقریباً۱۸۰۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔“[۲]

ڈاکٹر رشید اشرف کی فراہم کردہ ان معلومات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے اپنے اسلاف سے جو میراث پائی تھی نہ فقط اس کو محفوظ رکھا بلکہ اس کو آگے بڑھانے اور ترقی دینے کی بھی بھرپور کوشش کی۔

مولانا محمد حسین آزاد کا شمار ان چند علما اور ادبا میں ہوتا ہے جن کی علمیت کا ادراک اور توثیق ان کے اپنے عہد میں بھی کی گئی۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ انہیں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا تھا۔ مولانا آزاد کو یہ اعزاز ۱۸۸۷ میں دیا گیا۔ شمس العلما کا خطاب عمومی نوعیت کے کام پر نہیں دیا جاتا تھا بلکہ یہ خطاب اس بات کی دلیل تھا کہ اہلِ علم کی نظر میں آزاد کے علمی کارنامے غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ اس حوالے سے آغا باقر نے لکھا ہے کہ

> ”۱۸۸۷ میں مولانا آزاد کو ملکہ وکٹوریا کی جوبلی کے موقعہ پر تعلیمی اور ادبی خدمات کے صلے میں شمس العلماء کا خطاب ملا“[۳]

آزاد نے بعد میں اپنے تحقیقی اور تخلیقی کارناموں سے اس بات کا ثبوت فراہم کیا کہ وہ واقعی اس خطاب کے قابل تھے حقیقی معنوں میں وہ شمس العلما ہیں۔

آزاد کی تخلیقی اور تحقیقی کاموں میں دیگر نمایاں خوبیوں کے ساتھ ساتھ ماضی پرستی کا رویہ بھی بہت اہم ہے۔ انہوں نے حال میں رہ کر ماضی کے ساتھ اپنا تعلق بہت مستحکم کر لیا۔ ان کی مختلف تخلیقات کا جائزہ لینے سے یہ بات بہت واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے ماضی کے ساتھ اپنے تعلق کے استحکام کے لیے

مسلسل کام کیا۔ ان کی تصانیف، تحقیقات اور تالیفات میں ماضی کے ساتھ لگاؤ اور تعلق بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ماضی کے جھروکوں سے وہ تمام چیزیں اپنے قاری کو دکھانے کی کوشش کی ہے جو ان کے خیال میں دیکھنے کے قابل تھیں۔ اس طرح ان کا قاری چند نِکات کے مطالعے سے پوری تاریخ سے پوری طرح آگاہ ہو جاتا ہے اگر فرداً فرداً ان کی تصانیف کا جائزہ پیش کیا جائے تو ہر قدم پر ماضی کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ عتیق اللہ نے قصص الہند کے حوالے سے آزاد کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''قصصِ ہند میں کسی خاص عہد یا ہندوستان کی مکمل و مبسوط تاریخ کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے بلکہ محض ان چیدہ چیدہ تاریخی شخصیات ہی پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ جو مختلف سے توجہ طلب رہی ہیں۔ آزاد نے انہیں بڑی بے تکلف اور حکائی زبان میں ادا کرنے کی سعی کی ہے۔ آزاد نے بڑی حد تک معروضیت کا بھی خیال رکھا ہے۔''[۴]

آزاد کا یہی اسلوب نگارش ان کی دیگر تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے آزاد نے ماضی کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرنے کے ساتھ اپنے قاری کے تعلق کو بھی مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ماضی کے ادب پاروں کو سلیس اور خوب صورت انداز میں پیش کر دیا ہے۔ ان کے اس کارنامے کا اعتراف اردو کے نقاد کھل کر کرتے ہیں۔ ایک عام قاری بھی اس حقیقت کو آسانی سے محسوس کر سکتا ہے۔

در حقیقت آزاد اپنے اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی اس کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے رام بابو سکسینہ کہتے ہیں کہ

> ''یہ لاجواب کتاب جماعت طلباء میں نیز پبلک میں بے حد مقبول ہے بچے اس کو دلچسپ واقعات کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور پڑھے لکھے اس کی عبارت کے دلدادہ ہیں۔''[۵]

عام طور پر یہ تصور کیا جاتا ہے کہ نسلِ نو کا قلبی اور فکری تعلق ماضی سے کمزور ہو چکا ہے لیکن اگر ماضی کو حال کے تقاضوں کے مطابق ڈھال کر پیش کیا جائے تو ماضی کے ساتھ اس تعلق کو دوبارہ مضبوط کیا جا سکتا ہے۔ آزاد کی ماضی پرستی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے تحقیق کر کے ماضی کو نہ صرف علمی حلقوں میں متعارف کرایا بلکہ نسلِ نو کے دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش بھی کی ہے۔

جہاں محمد حسین آزاد نے ماضی کو اپنا کر وقت کی پابندیوں کو ختم کیا اور اپنے عہد سے بہت پہلے کے لوگوں کی تخلیقات کو سامنے لے کر آئے اسی طرح انھوں نے مکان اور زبان کی پابندیوں کو بھی کچل ڈالا۔ آزاد نے اردو کے ادبا اور شعرا کے ساتھ ساتھ فارسی کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی بہت اہمیت دی۔ اس حوالے سے ان کی سخندانِ فارس بہت اہمیت کی حامل ہے۔

آزاد نے فارس سے تعلق رکھنے والے قدیم شعرا اور ادبا کا بہت جامع تذکرہ کیا ہے۔ اردو کے نقادوں نے اس کتاب کو اہمیت کا جا بجا اعتراف بھی کیا ہے۔ پروفیسر صادق نے اپنی کتاب میں سخندانِ فارس سے متعلق لکھا ہے۔

> "سخندان فارس جس میں آزاد نے وسطِ ایشیا کے مشاہدات قلمبند کئے ہیں۔ گزشتہ صدی کی چند جاندار کتابوں میں سے ایک ہے۔"[٦]

گویا سخندان فارس میں گزشتہ صدی کے ادب پر بات کی گئی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں وسط ایشیا کے حوالے سے بات کی گئی ہے۔ اس طرح آزاد نے زمان اور مکان کی تمام تر پابندیوں کو توڑ دیا ہے۔

آزاد کی ماضی پرستی محض ماضی میں جھانکنے کا جنون ہی نہیں ہے بلکہ ان کی علمی اور تحقیقی عظمت کی علامت بھی ہے۔ انہوں نے علمی اسلوب میں ماضی کے شعرا اور ادبا کے کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ ماضی کے ادبی کارناموں کے حوالے سے اس قدر گہرا علم اور فن سے دلچسپی آزاد ہی کا کارنامہ ہے۔

آب حیات آزاد کا بہت بڑا علمی اور قلمی کارنامہ ہے۔ اس میں انہوں نے اسلاف کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔ ماضی کا پورا علمی سرمایہ آزاد نے نسلِ نو کے سامنے لا کر پیش کر دیا ہے۔ اگر ہم آزاد کے دیگر کاہائے نمایاں کو نظر انداز بھی کر دیں تب بھی آب حیات ان کی علمی وسعت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔

آبِ حیاب چوں کہ ان کی ماضی کے ساتھ خصوصی دلچسپی کی سب سے بڑی دلیل ہے، اس میں آزاد نے پرانے شعرا کے کلام اور زندگی کے مختلف گوشوں کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس لیے یہاں بھی ایسی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے جس میں یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ آزاد نے ماضی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کو اپنے لیے باعث شرف بھی تصور کیا ہے۔

سید وقار عظیم نے "تنقیدِ آزاد اور اس کا مخصوص مزاج" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں کہا ہے

"پہلے دور کے شاعروں کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے انداز بیان کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیمی اور مضمون بھی اکثر سبک اور مبتذل ہوں گے مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگی ہے جیسے ایک حسن خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کرتی ہے"[۷]

یہاں بھی آزاد ماضی کے مصنفین اور شعرا کے اندازِ بیاں سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ان امور کی تعریف کی ہے جو عام قاری کی نظر میں ایک خامی ہو سکتے تھے۔ اس بات سے یہ حقیقت بہت واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کے ہاں ماضی کے شعرا اور مصنفین کا اندازِ بیاں ہی ایک معیار کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس معیار سے مکمل طور پر متاثر ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کے مزاج میں پائی جانے والی ماضی کی محبت ہے۔

آبِ حیات میں انہوں نے ماضی کی ایک واضح جھلک بہت ہی منفرد انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ انفرادیت بھی ماضی کے لگاؤ اور محبت کی مرہون منت ہے۔ جس باریکی اور تفصیل سے انہوں نے ماضی کے شعرا اور ادبا کو بیان کیا ہے وہ قلبی تعلق اور لگاؤ کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ آبِ حیات میں آزاد کے اندازِ بیاں کے حوالے سے ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں۔

"آب حیات محض اردو شاعری کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ایک توانا، متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز ہے جو عہد ماضی کو از سر نو زندہ کر کے ہماری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے"[۸]

ڈاکٹر محمد صادق کے اس تبصرے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کے ہاں ماضی کا جو تذکرہ ملتا ہے وہ بھولی بسری ماضی کی یاد نہیں ہوتی بلکہ ایک زندہ و جاوید اور شاندار ماضی کا عکس ہوتا ہے جو قاری کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ یہی ماضی کی شان و شوکت گزرے وقت کا بھولا بِسرا قصہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ ایک زندہ و جاوید حقیقت کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔

"یہاں آبِ حیات میں کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ انہیں شاعروں کے حوالے سے یہاں مروجہ ادب و آداب، نشست و برخاست کے طور، یار و اغیار کی دوستیوں

اور دشمنیوں کے قصے ان کی آپس کی لڑائیاں، جھگڑے، فساد کس کمال کے ساتھ
بیان ہوئے ہیں کہ لوگ جیتے جاگتے ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں"[9]

یہ تبصرہ اس بات کی دلیل ہے کہ آزاد نے ماضی کو حال کے آئینے میں بسا کر بیان کر دیا ہے۔ گویا ان کے ہاں ماضی کی ایسی خوب صورت تصویر موجود ہے جو حال میں بیٹھے ہوئے انسان کو بھی متاثر کرتی ہے۔ حال کی رنگینیوں میں بیٹھا انسان بھی ماضی کی خوب صورتی کا بھرپور لطف اٹھا سکتا ہے۔

اس قسم کا طرز تحریر اسی صورت میں میسں رہو سکتا ہے جب انسان کے دل و دماغ میں ماضی کے چراغ ہمہ وقت روشن رہیں۔ اگر ہم حال میں بیٹھ کر ماضی کو سوچنا اور لکھنا شروع کر دیں تو ممکن نہیں کہ ہم ماضی کی ترجمانی کا حق ادا کر سکیں گے۔ ان حقائق کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ آزاد کے ہاں ماضی پرستی ان کے دل و دماغ پر مسلط ایک جادو تھا جو ان کی تحریر و تخلیق میں جا بجا بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

آزاد نے ایسے ادب پاروں کو محفوظ کرنے کا فریضہ بھی سر انجام دیا جو ماضی کا حصہ بن چکے تھے۔ انہوں نے اپنے استاد ذوق دہلوی کا دیوان بھی مرتب کیا۔ نند کشور وکرم اس حوالے سے کہتے ہیں

"آزاد نے اپنے عزیز استاد حضرت ذوق دہلوی کی ترتیب و تدوین کا
کارنامہ بھی انجام دیا تھا۔ جسے اہل اردو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اگر یہ
مرتب دیوان وجود میں نہ آتا تو ذوق کا نام صرف تذکروں تک ہی محدود رہتا اور ہم
ان کے کلام کے مطالعے سے محروم رہ جاتے۔ یہ آزاد کا ہم پر احسان ہے کہ انہوں
نے لاتعداد تکالیف برداشت کیں مگر اسے ضائع ہونے سے بچا لیا"[10]

آزاد کی نثر کی طرح نظم میں بھی ماضی کی ان روایات کا رونا واضح انداز میں رویا گیا ہے جو اب ہماری روایات کا حصہ نہیں ہے۔ آزاد چوں کہ نثار کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں بھی ماضی کی روایات کے احیا کی تمنا بہت واضح اور نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی ایک مشہور نظم حب وطن میں لکھا ہے

اے آفتابِ حب وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر اہو رہا
اور انتظا م دل زیر و زبر ہو رہا
حب وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں

حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں"

اس نظم پارے کے دو پہلو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اول تو یہ کہ انہوں نے اپنی خواہش کے اظہار کے لیے ماضی کو پکارا ہے۔ دوم یہ کہ آزاد اپنے وطن سے محبت کے حوالے سے ماضی کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ یہ ان کے عمومی رویے کی ترجمانی ہے جس میں وہ ماضی کو ایک مثال بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک حال کو ماضی کی طرح ہونا چاہیے تا کہ تا کہ ایک خوب صورت معاشرت کی تشکیل ممکن ہو۔

آزاد کی تخلیق "مثنوی صدر تہذیب" میں ان کی ماضی کے ساتھ محبت اور ماضی کی یاد کا احساس مزید کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں کھل کر ماضی کے حسن کا بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی
اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی

مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا
اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا

وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی
اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی[۲]"

یہاں بھی ان کے دماغ میں عہدِ گزشتہ کی تاثیر بہت واضح انداز میں نظر آرہی ہے۔ انہوں نے ماضی کے ان لمحات کو ہی مثالی قرار دیا ہے جو اب ان کے پاس نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں توازن اور خوبصورتی ماضی کا حصہ تھی۔ اب ایسی چیزیں دستیاب نہیں ہیں۔

آزاد کو معاشرت، سیاست اور اخلاقیات الغرض ہر پہلو سے ماضی ہی کی یاد ستاتی ہے۔ محمد حسین آزاد "سیر ایران" میں لکھتے ہیں

> بندہ آزاد خانماں برباد تباہی دہلی کے کئی سال تک سرگرداں پھرتا رہا ۔ جب کئی برس کے بعد قسمت نے قرار پکڑا تو اور اتنی فرصت ملی کہ اپنے حال پر افسوس کروں تو سب سے زیادہ افسوس مجھے اپنے اس کتب خانے کا تھا جو دو پشت سے میرے بزرگوں نے جمع کیا تھا اور میں نے بھی ہمیشہ اس کے بڑھانے اور آراستہ کرنے کی کوشش کی تھی۔[۳]"

آزاد کے اس اندازِ گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کے لیے ماضی کی یادیں سمیٹے ہوئے ان کے کتب خانے کی کتابیں بہت اہمیت کی حامل ہیں جن سے ان کے اسلاف اور اجداد کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس بات کا انہوں نے کھل کر اظہار کیا ہے کہ یہ کتب چوں کہ ان کے اسلاف کی یادگار ہیں ،اس لیے اہمیت کی حامل ہیں۔ جس طرح آزاد نے اپنے اسلاف کے افکار کو اہمیت دی ہے اسی طرح انہوں نے ان کی یادگار کے طور پر چھوڑی ہوئی کتب کو بھی اہمیت دی ہے اور ساتھ ہی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ہے کہ وہ اس میں مزید اضافہ بھی کرنا چاہیے ہیں۔

آزاد کو جہاں بھی موقع ملا ہے انہوں نے ماضی کی یاد کو ضرور تازہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کو نہ صرف اپنے علمی سرمائے اور اپنے اسلاف سے عقیدت تھی بلکہ اس انہیں ماضی کی تمام تر امور اور روایات سے بھی عقیدت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی پرستانہ رویہ ان کے ہاں جابجا نظر آتا ہے۔

ماحصل: مولانا محمد حسین آزاد بہت بڑے ادیب اور محقق ہیں اسی طرح ان کا عہد بھی بڑے شعرا اور ادبا کا عہد تھا لیکن آزاد کے قلب و نظر میں جو بات سرایت کر چکی تھی وہ ماضی سے محبت تھی ۔انہوں نے اپنے کلام اور نثری نصانیف میں جابجا اپنی اس ماضی پرستی کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف برصغیر کے شعرا کا تذکرہ کیا ہے بلکہ انہوں نے فارسی شعرا اور ادیبوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایران کا سفر بھی کیا ہے اور وہاں جا کر فارسی علم و ادب کا جائزہ بھی لیا اور بعد میں اپنی تصانیف میں اپنی تحقیقات پیش کر دیں۔

ان کی ان علمی کاوشوں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ آزاد کی آزاد نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی شعر و ادب میں بھی دلچسپی لی ہے اور فارسی شعرا کے ماضی کی کھوج لگانے کی بھی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان کا ماضی اور ماضی کے کردار مردہ کردار نہیں ہیں بلکہ ان کے کردار باقاعدہ زندہ کردار ہیں ۔ جو ہماری آنکھوں کے سامنے بعض اوقات گھومتے پھرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب کی واضح مثال ”آبِ حیات“ ہے۔ اس میں انہوں نے شعرا کے واقعات اور ان کے مزاج کی خوب صورت تصویر کشی کی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مظفر حنفی، محمد حسین آزاد، ساہتیہ اکادمی، دہلی، ۱۹۹۶، ص ۱۰

۲۔ ڈاکٹر رشید اشرف خان، مولانا محمد حسین آزاد اور ان کا شعری سفر، اردو چینل پبلی کیشنز، بمبئی، 2015، ص ۱۵

۳۔ آغا محمد باقر، تاریخ نظم و نثر اردو، شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب، لاہور، ۱۹۳۳ ص ۲۸۶

۴۔ عتیق اللہ، مونوگراف محمد حسین آزاد، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۲ ص ۳۵

۵۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادب اردو، عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۹ ص ۴۱

۶۔ ڈاکٹر محمد صادق، محمد حسین آزاد، احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۷۲ ص ۴۲

۷۔ سید وقار عظیم، مشمولہ آب حیات کا تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ، ص ۱۲

۸۔ ایضاً۔ ص ۷۰

۹۔ انتظار حسین، مولانا حالی، مولانا آزاد، علامہ شبلی، مشمولہ جدید اردو نثر کے معمار، غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ص ۱۳،

۱۰۔ نند کشور وکرم، محمد حسین آزاد، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۲، ص ۹۱

۱۱۔ محمد حسین آزاد، نظم آزاد، نول کشور پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۱۰، ص ۴۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۳۔ محمد حسین آزاد، سیر ایران، کریمی پریس، لاہور، ص ۵۷